⊙ محمد فرید
لیکچرر،شعبہ اردو،او۔پی۔ایف بوائز کالج، H-8/4،اسلام آباد
⊙⊙ ڈاکٹر صلاح الدین درویش
ایسوسی ایٹ پروفیسر / صدر شعبہ اُردو، اسلام آباد بوائز کالج، H-9،اسلام آباد

دشتِ سُوس کے نمائندہ کرداروں کے افکارونظریات

(تنقیدی مطالعہ)

Abstract:

Dasht-e-Soos, more sentimental and more philosophical, amazing, fascinating and astonishing dispassionate analysis of a bye gone age of Muslim history, One can imagine that the main player of Jamila Hashmi's this novel would be Hussain Bin Mansur Hillaj. However throughout the story one cannot escape the overbearing aroma of "Aghul" and other characters. This was an unexpected love story or at least with an unusual diction that one does not come across in Urdu fiction .Many of the critics expected a story that would bring out Hillaj as he was commonly imagined but Jamila Hashmi had done a lot of historical and theoretical research to write about the Sufi Saint's inner journey. Someone who challenged the Status -quo of religion in 9th century Baghdad.But Jamila Hashmi's interest was in writing about the journey which started with Aghul"and ended with every bit of Hillaj's body, as it was hung by the king's decree and then chopped into pieces , screaming Anal Haq.

Keywords:

Novel Dasht-e-Soos Jamila Hashmi Mansur Hillaj Aghul Baghdad

دشتِ سُوس کے نمائندہ کرداروں کے افکاروخیالات کے تنقیدی جائزے سے قبل اس بات کا ذکر کرنا انتہائی ضروری ہے کہ نقادوں نے تاریخی طور پر ان کے درست ہونے یا ان کرداروں کی اصل کے مطابق تشریح نہ کرنے پر سوالات

اٹھائے ہیں۔ جمیلہ ہاشمی نے ان اعتراضات کے جوابات بھی دیے ہیں لیکن یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ جمیلہ ہاشمی نے کوئی تاریخ نہیں لکھی۔ انھوں نے ایک ناول لکھا ہے جس میں ناول نگار تاریخ کے ساتھ ساتھ تخیل کو بھی بروئے کار لاتا ہے۔ تاریخی حقائق کے حوالے سے اسلم سراج الدین اور ڈاکٹر حسن اختر نے اعتراضات کیے ہیں تو محمد علی صدیقی، ڈاکٹر سلیم اختر، انتظار حسین اور انور سدید نے اس کا دفاع بھی کیا ہے۔ دشتِ سُوس کے نمائندہ کرداروں کے افکار و نظریات کا مطالعہ پیش خدمت ہے:

حسین بن منصور حلاج:

دشتِ سُوس کا حسین بن منصور ایک غیر معمولی روایت شکن، دروں بیں، سماج کی نگاہ میں باغی، دیوانہ، نا قابلِ قبول فلسفی اور مفاہمت کے تصور سے ناآشنا کردار ہے۔ دنیاوی کشش و لذتوں سے کنارہ کش، اصول و ضوابط کی پابندی کرنے والا، ایثار و قربانی کے جذبے سے سرشار، ماورا سے لو لگانے والا، نفس کی گہرائیوں میں غوطہ زنی کرنے والا، توبہ و استغفار میں مثالی، قناعت و استغنا سے مالا مال۔ اس کے حق سے عشق کو عقل کی کسوٹی پر پرکھے بغیر اس کے ذہنی اور روحانی اضطراب اور مابعد الطبیعیاتی تجربات کی صداقت پر یقین کرنا ہی پڑتا ہے۔ اس کے نظریات میں جان نظر آتی ہے۔ اسلوب احمد انصاری لکھتے ہیں:

> ''حسین کی سرشت کسی اور ہی مٹی سے بنی ہے۔ وہ ایک طرف مذہبی ارکان کی بجا آوری اور اپنی تربیت نفس میں ہمہ تن ڈوبا رہتا ہے اور دوسری جانب اس کی زندگی آغاز کار ہی سے ایک visionary کی زندگی رہی ہے۔ اس کا تخیل پیش بین یعنی Proleptic ہے۔ اسے ایک طرح کا سری معمول Occuete Medium کہہ لیجیے۔ انا الحق کا نعرہ مستانہ جو اس کے لبوں پر جاری رہتا ہے۔ اس کی زندگی کا ایک جز و لاینفک ہے۔ یہ الفاظ دیگر نہ صرف نفس کی تربیت بلکہ انفرادی نفس کو ماورائی نفس میں مدغم کر دینے کا تصور اس کے ہاں ایک توانا اساسی حیثیت رکھتا ہے۔''(۱)

حسین کی شخصیت میں بے چینی اور بے یقینی کوٹ کوٹ کر بھری ہے جو ہمہ وقت تلاش حق میں اضطراب اور کشاکش کی کیفیت میں رہتا ہے۔ وہ دروس اور مجادلوں کی گرما گرمی سے کوئی اثر قبول نہیں کرتا۔ وہ ماورا سے بھی ماورا کے سفر کا راہی ہے۔ وہ حق سے براہِ راست ربط و اتصال کا خواہش مند ہے۔ اسکا نعرہ 'انا الحق' من و تو کے درمیان فرق کو راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتا ہے وہ بلا کسی ضابطے و قاعدے کے اس رکاوٹ کو عبور کر کے حق میں خود کو جذب کرنا چاہتا ہے۔ وہ شمع بھی خود ہی تھا اور پروانہ بھی۔ وہ خود کو خود پر نثار کرنا چاہتا تھا:

> ''وہ شمع تھا گویا جس سے وجود میں روشنی تھی۔ وہ پروانہ تھا جو اس شمع کے گرد نثار ہوتا تھا یہاں وہاں سب جگہ وہ تھا اور داخلی دنیا اس سے معمور تھی۔ وہ عقبیٰ تھا۔ وہ قیامت تھا۔ وہ طوفان تھا جو ہستی پر نہایت شدت سے محیط تھا۔ وہ کنارے پر بھی تھا اور ڈوب بھی رہا تھا۔ کائنات اور تخلیق سب وہ تھا۔''(۲)

حسین بن منصور حلاج نے اپنے اندر جلتی آگ سے یہ بتایا ہے کہ ولولۂ شوق تہذیب نفس کی منزلیں طے کرتے وقت اس راہ سے گزرتا ہے جس میں عشق کہیں مزرعِ زندگی ہے اور کہیں جان سے گزرنے کا نام ہے:

در ہے جاناں جاں ہم رفت
جان ہم رفت جاں ہم رفت (۳)

حسین انسانی اور للّہی رشتوں کی گم شدہ کڑی کی بازیافت کا استعارہ ہے۔ اس کے منہ سے نکلے ہوئے ایک نعرے 'انا الحق' نے فقہی دنیا میں ہیجان برپا کر دیا جو اس کے اور اس دور کے فقہا و صلحا کے نزدیک وجہ نزاع بن گیا۔ صوفیا کے ایک طبقے کے نزدیک وہ زندیق اور قابل گردن زدنی تھا تو دوسرے طبقے کے نزدیک وہ رموزِ حق کا آشنا تھا۔ نعرہ انا الحق اس کے جسم و روح کو عشق حقیقی کی آگ میں ڈال کر کندن بنا دیتا اور اس کی رگ رگ اور نس نس میں خدائے برحق کی محبت جاگ اٹھتی اور وہ خود سے بے خود ہو جاتا اور پکار اٹھتا:

''میں وہ ہوں جسے میں چاہتا ہوں اور جس کو میں چاہتا ہوں وہ میں ہی تو ہوں ہم دو روحیں ایک جسم میں مقیم ہیں۔ جب تم مجھے دیکھتے ہو تو گویا اسے دیکھتے ہو اور اگر تم اسے دیکھو تو ہم دونوں کو دیکھ لو گے۔'' (۴)

راہ سلوک کے مسافر میرؔ کے مصرع 'پر یہ کہاں مجال جو کچھ گفتگو کریں' کی عملی تصویر ہوتے ہیں اور مرشد کے سامنے سوال کرنے سے گریز کرتے ہیں لیکن حسین ایک ایسا صوفی تھا جو سوال کرتا تھا وہ بے مرشد ہی رہا۔ تستر میں سہل بن عبداللہ تستری، بصرہ میں عمرو بن عثمان مکی اور بغداد میں جنید بغدادی کی صحبتیں بھی اس کی بے چین روح کو قرار نہ دے سکیں۔ حسین روایتی درس سے ماورا، پر غرور اور اپنے جسم کی قوت سے آگاہ اور اپنی ذات کے عشق میں گرفتار تھا۔ اسے تو اس بات کا بھی احساس نہ تھا کہ مرشد کے بغیر ٹھوکر لگتی ہے:

''کبھی کبھی میں سمجھتا ہوں یا مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مرشد کی ضرورت مجھے نہیں ہے۔ حسین نے دبے لفظوں میں بہت سہم کر کہا۔ تم کیا کہہ رہے ہو حسین۔ کیا بغیر استاد کے، بغیر مرشد کے کسی نے یہ جان جوکھوں کا سفر طے کیا ہے۔ کبھی تم نے دیکھا ہے کہ کوئی کشتی بغیر ملاح کے بحرِ محیط پر رواں ہو سکتی ہے۔ ذکر کا اذن بھی جب تک اپنے مرشد سے نہیں ملتا اس میں کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکو گے...... جب سالار کارواں کے بنا چلو گے، تنہا چلو گے تو کسی منزل پر نہیں پہنچ پاؤ گے، نہ سلوک کی اور نہ طریقت کی، منصور نے تلخی سے کہا۔ کچھ خزانے ہیں جو ہاتھ لگ جائیں تو بہت ہوتے ہیں۔ اپنا سفر آسانی سے طے کیا جا سکتا ہے، حسین نے مبہم سا جواب دیا۔'' (۵)

حسین بن منصور حلاج کی قوت ارادی فولاد و آہن سے مرکب ہے۔ حسین ایسی زندگی جو کھڑے پانی کی طرح بدبودار اور بے حرکت ہو کو پسند نہیں کرتا۔ وہ ایک بھرپور اور جدوجہد سے بھرپور زندگی گزارنے کا متمنی ہے۔ وہ ریاست کے ایک ادنیٰ کارندے اور راہ تصوف کے لگے بندھے اصولوں کے تابع رہ کر زندہ رہنے پر موت کو ترجیح دیتا ہے۔ وہ آسمان پر چمکتے ستارے کی مانند ہے جو اپنی موجودگی کا احساس دلاتا ہے:

''وہ ایک شعلہ مستعجل تھا۔ایک ستارے کی طرح روشنی سے جو محض اس لیے فضا میں ٹوٹ کر بکھرتا ہے کہ آسمانوں پر محو سفر رہنے کا اس میں حوصلہ نہیں ہوتا۔خرام ناز سے تو یہی بہتر ہے کہ بجھ جایا جائے۔''(۶)

حسین اکتساباتِ روحانی کے بل بوتے پر خلاف معمول اشیا کو برتنے پر قادر ہے اور مستجاب الداعوات بھی ہے۔وہ ایک ایسی مافوق الفطرت ہستی ہے کہ جس کے سامنے حجابات کو اٹھا دیا جاتا ہے اور حقیقت اپنی حقیقی اور تنزیہی شکل میں جلوہ گر ہو جاتی ہے۔وہ اپنی باطن کی آنکھ سے وہ دیکھ لیتا ہے جس کا ادراک ظاہری آنکھ کرنے سے قاصر رہتی ہے۔اس میں ایک مستغرق اور مجذوب شخص کی تمام نشانیاں پائی جاتی ہیں۔اس سے ایسی کرامات ہوتی ہیں کہ جو روحانی طور پر اس کے مقام بلند کی دلالت کرتی ہیں:

''اس کے سراپے میں عجیب جاہ وجلال تھا۔وہ چلتا تو لوگ راستہ چھوڑ کر الگ ہو جاتے۔کوئی اس سے بات کرنے کی کوشش کرتا تو لگتا بات منہ سے نہیں نکلتی اور زبان لڑکھڑا جاتی۔آوارہ بچوں نے اس کی کھلی دکان سے کچھ چرانے کی کوشش کی تو ان کے ہاتھوں نے جواب دے دیا اور وہ اپنے ارادے سے باز آئے تو تندرست ہو گئے۔نہایت دبی زبان سے لوگوں نے اس کے اسرار کو موضوع سخن بنا لیا۔یہ حلاج کہاں سے آیا تھا؟ جن اس کے تابع تھے۔اس کے روئی دھننے کی رفتار عام لوگوں سے بہت زیادہ تھی۔لوگ کہتے وہ خود بیٹھا رہتا ہے سب کام دستِ غیب سے ہوتا ہے۔''(۷)

''اس کو خدا نے دس آدمیوں کی طاقت دی ہے۔ان میں سے ایک بولا...... وہ جسے چھو دیتا ہے اسے شفا ہو جاتی ہے۔وہ جس کی طرف دیکھ لیتا ہے اس کے کام بن جاتے ہیں۔''(۸)

''صحرا میں تستر سے روانہ ہونے کے بعد جب بھیڑ کو پانی کی کمی نے جاں بلب کر دیا تھا تو حسین نے ہاتھ زمین پر مار کر پانی کا چشمہ جاری کر دیا تھا۔''(۹)

''حسین نے ہاتھ بڑھا کر کندھے پر رکھا۔حبشی پلٹ کر اس کے پاؤں پر گویا گر پڑا تھا اس لیے کہ اس کا درد یک بیک غائب ہو گیا تھا۔''(۹)

''جو دھوپ سے کسی پناہ اور اوٹ میں نہیں جاتا تھا۔جو ہوا کو حکم دیتا کہ چلے، جو دھوپ اور روشنی کو روک دیتا۔''(۱۰)

''یہ قیدی تم نے آزاد کیے ہیں۔وہ جو پکڑ کر واپس لائے گئے تھے کہتے ہیں کہ انہیں تم نے اشارہ کیا تھا اور دیواریں اپنی جگہ سے ہٹ گئی تھیں۔''(۱۲)

''تم پر یہ الزام ثابت ہو چکا ہے کہ تم مردوں کو زندہ کرتے ہو۔''(۱۳)

حسین بن منصور اپنی اندر کی روشنی سے زندان میں بھی چراغاں کر دینے کی استطاعت رکھتا تھا۔وہ ایسا مقتول تھا کہ اس نے قتل ہونے سے پہلے اپنے قاتلوں کو معاف کر دیا تھا۔حسین عشق حقیقی کے معیار کا حوالہ بن گیا۔بقول میر تقی میر:

؎ موسم آیا تو نخل دار پہ میرؔ
سر منصور ہی کا بار آیا

اغول:

لمبے زردی مائل سنہرے بال جیسے چاندنی ان میں گندھی ہو۔ چہرہ اور آنکھیں بے مثال یہ سراپا نسطوری راہبہ اغول کا ہے جس کا حسن اس کا سب سے بڑا قصور اور فروخت ہو کر کسی حرم محل کی چار دیواری میں بند رہ کر پوری زندگی گزارنا مقدر ٹھہرا۔ اغول ایک حقیقت پسند عورت تھی اسے اس بات کا بخوبی ادراک تھا کہ اس کی منزل کیا ہوگی۔ وہ خوابوں کی زندگی پر یقین نہیں رکھتی تھی اسے پتا تھا کہ اسے بکنے سے کوئی نہیں بچا سکتا یہاں تک کہ اس کی ماں بھی ایسا نہیں کر سکتی وہ بے بسی کی تصویر نظر آتی ہے:

> ''حسین حیرت سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ تمہاری ماں تمہاری مدد نہیں کر سکتی؟ بہت دیر کے بعد اس نے پوچھا نہیں، کوئی بھی نہیں، خدا بھی نہیں۔ اپنے مقدر سے بھاگ کر کوئی کہاں جا سکتا ہے۔ کوئی ہماری مدد نہیں کر سکتا۔ وہ اپنے کتے کے بالوں میں منہ دے کر بیٹھی تھی۔ شاید وہ رو رہی تھی۔'' (۱۴)

حسین سے اغول کی چند ہی ملاقاتیں غیر متوقع اور پراسرار طریقے سے ہوئیں لیکن اس کے باوجود وہ کبھی اپنے آپ کو حسین کے طلسم سے آزاد کرنے پر قادر نہ ہو سکی۔ اسے پوری کائنات میں حسین کی خوشبو پھیلی نظر آتی تھی۔ اس کی شخصیت کے گرد ایک ہالہ تھا جس میں ایک ہی روشنی پیدا ہوتی اور ٹھہر جاتی تھی اور حسین کو پکارا کرتی تھی۔ اس کا جسم اپنی مدتوں کی ترسی ہوئی سوکھی رگوں میں ایک سیال کو چلتا محسوس کرتا۔ حسین کے نام پر یہ روانی بڑھ جاتی اور اس کے اندر محبت کے دیے جلنے لگتے۔ حسین سے آخری ملاقات کے دوران امتداد زمانہ کے باوجود وہ اپنی زندہ و پائندہ محبت کا اعتراف کرنے میں ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کرتی۔ اگرچہ وہ بغیر مذہب تبدیل کیے نسطوری ہی رہی لیکن اس کے خیالات وعقائد لازوال اور پاکیزہ ہو چکے تھے:

> ''حسین! تم اس بات پر بھی گواہ رہنا میں ابن مریم کو خدا کا بیٹا نہیں سمجھتی۔ وہ حضرت جبریلؑ کے نفخ سے پیدا ہوئے تھے اور چونکہ وہ حضرت مریمؑ پر بشری صورت میں ظاہر ہوئے تھے اس لیے حضرت عیسیٰؑ میں زندہ اور اچھا کرنے کی جو قوت تھی وہ حضرت جبریلؑ کی جہت سے تھی۔ ان کا مردوں کو زندہ کرنے کا فعل اللہ کی طرف سے تھا کیونکہ یہ صفت صرف اور محض خدا کی صفت ہے اور جو لوگ یہ سوچتے ہیں کہ خدا ان میں حلول کر گیا تھا وہ گمراہ ہیں...... حسین یہ میری آخری گھڑیاں ہیں۔ ایماناً میں ایک نسطوری عورت ہوں مگر میرا عقیدہ سب سے مختلف ہے اب اس گھڑی جب زندگی کی روشنیاں ختم ہو رہی ہیں۔ میں نے ہمیشہ تمہاری قوتوں کو بھی خدا کی دین جانا ہے اور تمہارے نفس کو نفس مسیحا۔'' (۱۵)

دشتِ سُوس کی اغول اگرچہ ایک فرضی کردار ہے (واضح رہے کہ شیخ فریدالدین عطارؒ نے منصور حلاج کے

عنوان سے جو مفصل مقالہ لکھا ہے اس میں اشارتاً بتایا ہے کہ ایک مرتبہ حسین نے جوانی میں کسی حسین عورت کو دیکھا تھا) اور تاریخی اعتبار سے ابن منصور کے قتل کے محرکات بھی دیگر ہیں لیکن جمیلہ ہاشمی نے دشتِ سُوس میں اپنے تخیل کی بدولت اس رجحان ساز تاریخی ہستی کے یک رخ پن کو توڑ کر مختلف الجہات بنانے کی شعوری کوشش کی ہے۔ اغول نے نہ صرف حلاج کی شخصیت کو جذباتی اساس مہیا کی ہے بلکہ حامد بن عباس وزیر مملکت سے شدید دشمنی کے لیے جذباتی محرک بھی فراہم کیا ہے۔ ان کا تعلق پہلے تعلق خاطر بنا اور پھر تعلق روح حسین پر اغول کا اثر اس کی شخصیت کے اندر کی کائنات پر بھی ہے اور باہر کی کائنات پر بھی۔ ڈاکٹر میاں مشتاق لکھتے ہیں:

> ''خاتون اغول اس کے لیے ایک ایسا مضراب ہے جس نے اس کے تارحیات کو چھیڑا ہے اور نغمے ابل پڑے ہیں۔ وہ اس کی ذات بھی ہے اور ذات کے باہر کی کائنات بھی اور آخر وہی اس بڑے نغمے کو ایک عظیم غنائیہ بننے میں مدو معاون ثابت ہوتی ہے۔''(۱۶)

> ''اغول کا کردار ایک معاون کردار کے طور پر سامنے آیا ہے جو ایک طرف حسین حلاج کے سفر عشق میں مجاز کی سیڑھی کا کام کرتا ہے تو دوسری طرف مدمقابل کردار کے ساتھ حلاج کے الجھاؤ اور ٹکراؤ کا جواز بنتا ہے۔ اس طرح یہ کردار پلاٹ کے تصادم میں شدت پیدا کرنے کا ذریعہ بنا ہے۔''(۱۷)

اغول ایک بے پایاں محبت کرنے والی ماں تھی۔ اسے اپنے بیٹے سے شدید محبت تھی۔ اس کی بیماری کے دوران وہ سخت پریشان اور رنجیدہ ہوگئی تھی۔ اسی کی محبت میں ہی وہ بغداد کے محلّہ رصافہ سے تستر حسین بن منصور حلاج سے دعائے شفا کی غرض سے آئی تھی۔ اس کے بیٹے کا نام بھی حسین حلاج کی محبت میں حسین رکھا گیا تھا۔ اگر چہ وہ حامد بن عباس کا بیٹا تھا لیکن اغول نے اسے یکسر نظر انداز کیا اور اس کی زندگی اور سلامتی کے لیے مستجاب لدعوات حسین بن منصور کے پاس چلی آئی۔ وہ اسے ہنستے دیکھتی تو اسے نئی زندگی مل جاتی اور وہ اپنے دکھوں کو نظر انداز کر دیتی:

> ''اغول کو اپنے بچے سے جس کا نام وہ حسین پکارتی تھی، نہایت شدید لگاؤ تھا۔ وہ بڑی بڑی آنکھیں اور بہت کچھ جانتی ہوئی نگاہ۔ وہ کھلکھلا کر ہنستا تو اغول کے چہرے سے سائے ایک لمحے کے لیے دور ہو جاتے۔''(۱۸)

اغول خیال کی طرح نازک، مادے کی کثافتوں سے منزہ، لمس کی گرمی اور لذت سے ناآشنا تھی۔ اغول کے لیے حسین ایک روحانی اور غیر لمسیاتی وجود کی مانند تھا۔ وہ حامد بن عباس کی رفاقت میں بھی حسین کی سچی محبت کو دل سے نہ نکال سکی۔ اس نے اپنے بیٹے کا نام بھی حسین کی محبت کی یاد میں حسین رکھا۔ یوں اس کی پوری زندگی لفظ حسین کے گرد گھومتی نظر آتی ہے۔ اغول کا کردار ناول کا مجموعی تاثر بڑھانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اگر اغول کا کردار نہ ہوتا تو ناول ایک سپاٹ پلاٹ کی حیثیت کر جاتا۔ بعض ناقدین اس کے تاریخی طور پر حقیقت پر مبنی نہ ہونے کے باوجود اہم ہونے کا اظہار کرتے ہیں۔ اس ضمن میں انتظار حسین لکھتے ہیں:

> ''اعجاز حسین بٹالوی یہ کہتے تھے کہ اغول اگر نہیں بھی تھی تو اسے ہونا چاہیے تھا۔ تاریخی اعتبار سے اس کا وجود نہ ہو مگر جمیلہ ہاشمی نے اسے تخلیق کیا اور جائز کیا...... جیلانی کامران نے اپنی تحقیق سے

اغول کا تاریخی وجود بھی ثابت کر دیا جو لوگ تاریخی ناول میں تاریخ تلاش کرتے ہیں انھیں اس تحقیق کے بعد مطمئن ہو جانا چاہیے۔''(۱۹)

اغول کی شخصیت ایسی اچھوتی تھی کہ جسے عام معیاروں پر نہیں پرکھا جا سکتا۔اس پاکیزہ ہستی پر خداوند قدوس کا خاص لطف وکرم تھا۔حسین کی طرح وہ بھی روحانیت کے مقام بلند پر فائز تھی تبھی تو اسے حضرت عیسیٰؑ کی زیارت کا شرف حاصل ہوا تھا کہ جس پر وہ بجا طور پر فخر کا اظہار کرتی نظر آتی ہے:

''اغول نے کہا،تمھیں پتہ ہے نا کہ حضرت عیسیٰ دوبارہ پیدا ہوں گے اور وہ دنیا پر حکومت کریں گے۔مگر ان سے تمہاری سرمستی کا کیا تعلق،مبارک کا کیا تعلق؟میں نے انہیں دیکھا ہے خدا پاک مجھ پر کتنا مہربان ہے دلشاد میں تمھیں بتا نہیں سکتی۔''(۲۰)

اغول کے کردار سے جمیلہ ہاشمی نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ایک عورت کہ جس کے بارے میں کہا جاتا ہے 'وجود زن سے ہے کائنات میں رنگ' وہ کس قدر مظالم برداشت کرتی ہے۔وہ جس کے دم سے زندگی کی رونقیں ہوتی ہیں اسے ہر زمانے میں حقوق سے محروم رکھا گیا۔اس کے جذبات کا خون کیا گیا اور اسے گوشت پوست کا انسان سمجھنے کی بجائے کسی ایسی دنیا کی مخلوق بنا کر پیش کیا گیا جس کی اہمیت مردوں کے معاشرہ میں عضو معطل سے زیادہ کی نہیں ہے۔اغول کا نیلام ہونا،اسے حسین کی محبت سے دور کر دینا،حامد بن عباس جیسے ظالم اور شاطر انسان کے حوالے کر دیا جانا اور موت کے بعد خاموشی سے دفن کر دیا جانا سب واقعات اس کی مظلومیت کی دلالت کرتے ہیں۔ناول میں اغول کی بے بسی اور مجبوری کی کئی مثالیں موجود ہیں:

''مجھے کنیزوں کے سوداگروں کے پاس بیچ دیا جائے گا۔پھر میں کسی حرم کی محل کی چار دیواری میں بند ہو جاؤں گی اور یہی میری زندگی ہو گی۔''(۲۱)

''اس نے دیکھا بازار پر رونق اور معمور ہیں اور سوداگر کنیزوں کو فروخت کرنے کے لیے لا رہے ہیں۔اغول کو بھی لایا گیا۔وہ زرد چہرے اور دراز زلفوں والی کنیز شرم سے سر جھکائے پاؤں کے انگوٹھے سے اپنے سامنے کی زمین کرید رہی ہے۔وہ نظر اوپر اٹھا کر دیکھتی ہی نہیں تھی۔کون اسے خریدتا ہے۔اس واقعہ سے اسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔''(۲۲)

''قطعی ناامیدی سے جو بے حوصلگی پیدا ہوتی ہے۔اغول کا دل اس کے شکنجے میں تھا خونیں ہنگام۔وہ سخت بیمار ہو گئی۔ایک حدت سے تپتا ہوا اس کا وجود ریشمی چادروں اور ایرانی قالینوں اور شان دار خیموں کے بوجھ کو برداشت نہیں کر پاتا تھا۔وہ بند آنکھوں پر ہاتھ دھرے موت کی راہ دیکھتی۔''(۲۳)

''پھر وہ لیٹ گئی،جیسے تھک گئی ہو۔اس نے آنکھیں بند کر لیں۔کنیز نے اندر جھانکا نہایت سرد ہوا کا جھونکا پردوں میں سے سرسراتا اندر آیا۔چراغ کی لو کانپی اور پھر بجھ گئی۔''(۲۴)

حامد بن عباس:

حامد بن عباس کے اجداد نے عباسیوں کی خدمت کی تھی اور ذرا سی لغزش سے ان کی ساری خدمت خاک میں مل گئی تھی۔اس واقعے نے حامد کی شخصیت پر گہرا اثر ڈالا تھا۔حامد جہاں اقتدار سے محبت کرنے لگا تھا وہاں اس کی شخصیت میں احتیاط پسندی اور خوشامد بھی در آئی تھی۔حامد کی تربیت سختی سے کی گئی تھی اس لیے وہ کم گو اور ظلم کی حد تک اپنے کام میں منہمک رہنے والا تھا۔وہ باریک بین، بال کی کھال اتارنے والا سخت گیر اور منتقم تھا۔وہ کتابوں پر جھکا رہنے والا اور ہر حال میں دربار کے اعلیٰ عہدے تک پہنچنے کا خواہش مند تھا۔ وہ ہر خوب صورت اور اچھی شے پر اپنا حق سمجھتا تھا۔ وہ ایک ایسا انسان تھا کہ جس کے ظاہر و باطن میں بہت فرق تھا۔اس کی ذہنیت ادنیٰ غلاموں جیسی تھی۔حامد بن عباس حسین عورتوں، نوخیز لڑکوں اور شراب و ناچ گانے کا شیدائی تھا:

> ''وہ بہزاد کی حسین عورتوں کا شیدائی اور ظاہری تکلفات پر دم دیتا تھا۔مسقف بازاروں میں وہ کنیزوں کا پیچھا کرتا اور ان سے کہیں ملنے میں کامیاب ہو جاتا۔''**(۲۵)**

> ''حامد نے سر کے اشارے سے اجازت دی اور نبیذ کا پیالہ ساقی کنیز سے لے کر موسیقی کی ان دلنواز تانوں میں اپنے آپ کو گم کرنے لگا جو پس پردہ سازوں، آوازوں کے تانے بانے سے بُنی جا رہی تھیں۔رقص کرنے والے نوخیز لڑکے جب گردن کو خم دے کر نیم وا آنکھوں سے اسے دیکھتے تو نبیذ کا نشہ سہ آتشہ ہو جاتا۔لمبے سیاہ بالوں والی ساقی کنیز کی موہوم سی کمر پر نظر نثار ہونے لگتی اور ساری عمر اس آغوش میں گزار دینا ہی حاصل حیات ہوتا۔''**(۲۶)**

حامد بن عباس مدت سے مستوفی مالیات چلا آ رہا تھا۔اس ذمہ داری نے اسے انتہائی مغرور و ظالم بنا دیا تھا۔خزانے میں اگر ایک دینار کا بھی اضافہ ہوتا تو وہ یہ گمان کرتا گویا اس نے اسے اپنی جیب خاص سے دے دیا۔وہ کسی کی کامیابی کو دل سے قبول نہیں کرتا تھا۔حسین بن منصور کی عوام میں مقبولیت سے وہ تڑپ اٹھا۔حسین سے اس کا حسد ابتدائی عہد دربار سے شروع ہوتا ہے جو بالآخر حسین کی مثلہ کر کے دار تک لے جانے کا باعث بنتا ہے۔اسلم سراج الدین لکھتے ہیں:

> ''دشتِ سُوس میں حامد بن عباس کو ایسے حزنیہ کردار کے طور پر پیش کیا گیا ہے جس کے ساتھ قدرت بہت ناانصافی سے پیش آئی ہے۔حامد بن عباس سوچتا ہے۔زندگی نے اس کے ساتھ مذاق کیا تھا۔بھلا اس کا دل کسی کنیز میں کیوں نہیں لگا۔اسے ایک خلاء کا احساس کیوں رہا۔کوئی منجم، کوئی ستارہ شناس، کوئی پیش گوئی کرنے والا اسے کبھی بتا نہ سکا کہ جو ہوا وہ کیوں ہوا؟ کیونکر ہوا؟ وہی اس کا نشانہ کیوں بنا؟ راحت اور آسودگی اس کے لیے کیوں نہ تھی؟ اس کی روح کبھی کبھار تپ کر اس کے اندر پیاس ہی پیاس بن جاتی تھی۔آہ! اس کی ساری ناکامیوں اور نامرادیوں کا ذمہ دار صرف ایک شخص۔ایک گڈری پوش۔اپنے رنج و الم میں حامد بتدریج sadist ہو جاتا ہے۔''**(۲۷)**

حامد بن عباس اغول کی حسین سے محبت کو کبھی فراموش نہ کر سکا۔ وہ ایک زخم خوردہ جانور کی طرح اپنے مدمقابل کے لیے شدید نفرت کے جذبات رکھتا ہے اور حسین کو ٹھکانے لگانے کے حربوں پر غور و فکر کرنے لگتا ہے:

''وہ ہر اس نقش کو مٹا دے گا جو اغول کے اور اس کے درمیان تھا۔ اس کے، حامد بن عباس کے نصیب میں محبت نہیں نفرت تو تھی۔ شدید عمیق نفرت۔ سب چارہ گرنا کام ہو چکے تھے۔ زہر آلود نیزے کی انی، دل میں چبھ رہی تھی۔ وہ آخری کوشش کرے گا۔ ساری شکستوں کا انتقام لے گا۔ اگر محبت اس کا حق نہیں تو نہ سہی۔ نفرت کرنا، مٹانا، معدوم کرنا تو اس کے اختیار میں تھا۔ ہاں وہ ہمیشہ ان لق و دق صحراؤں میں آوارہ ہواؤں کی طرح سرگرداں نہیں رہے گا۔ وہ قرار پائے گا۔'' (۲۸)

حامد بن عباس اپنی تمام تر ذہانت اور فطانت کے باوجود ایک ناکام و نامراد شخص کے طور پر سامنے آتا ہے۔ اغول کا حسین سے محبت کرنا، مغرب میں عبیداللہ المہدی کے مقابلے میں شکستوں سے دوچار ہونا، اس کے بیٹے حسین کا اسے چھوڑ کر مغرب میں عبیداللہ المہدی کے پاس جانا، شغب کی حسین کی برابر ملاقاتوں پر خون کے آنسو رونا اور سب سے بڑھ کر حسین بن منصور حلاج کو مثلہ کر کے دار تک لے جانے کے باوجود لوگوں کے دلوں سے اس کی محبت اور بلند مقام کو کم نہ کر سکنا یہ سب حقائق اس کی ناکامیوں کی لمبی فہرست پیش کرتے ہیں۔ حامد ایک موقع پرست اور پراسرار شخص تھا جسے صرف اپنے مفاد سے دلچسپی تھی۔ لوگ اس کے شاطر پن سے واقف تھے اور اس سے محتاط رہنے میں ہی عافیت جانتے۔ جمیلہ ہاشمی اس کی شخصیت سے پردہ اٹھاتے ہوئے لکھتی ہیں:

''حامد کی طبیعت میں پراسراریت البتہ ہے جو اسے لوگوں کے لیے ذرا قابل توجہ اور خوف انگیز بناتی ہے۔ لوگ نہ اس کی محبت پر اعتبار کرتے ہیں اور نہ ہی اس کی توجہ کو درِخور اعتنا سمجھتے ہیں۔ وہ عجیب سا پلٹ جانے والا مسموم آدمی ہے۔ البتہ دشمن سخت ہے اور اس کی طبیعت میں ضد نے جو استواری پیدا کی ہے وہ لوگوں کو خائف کر دیتی ہے۔ امراء اس کے راستے کاٹتے ہی نہیں۔ دربار میں اکثر لوگ اس سے بچ کر رہتے ہیں۔ وہ لوگوں کو اپنے حسب ضرورت استعمال کر لیتا ہے۔ جیسے چھتے میں سے شہد حاصل کر کے اسے بیکار کر دیا جاتا ہے۔'' (۲۹)

سہل بن عبداللہ تستری:

سہل بن عبداللہ تستری تستر کی باغ و بہار سرزمین پر ایک خاموش اور کم آباد گوشے میں ایک مکتب کے مہتمم تھے۔ مکتب سے مشرق کی طرف ایک کم بلند پہاڑی کے سرے پر ایک چشمہ کے قریب خانقاہ تھی۔ یہاں کے درویش شب زندہ دار تھے۔ ان کے دل گرم، ان کی نگاہ پاک اور جان بے تاب تھی اور مشک نافے کی بو کی طرح سارے عجم میں ان کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ سہیل بن عبداللہ تستری کے مدرسہ میں شریک طالب علموں کو کڑی ریاضت، فاقہ کشی اور شب بیداری کے مراحل سے گزرنا پڑتا تھا۔ جان کو تحلیل کرنا پہلی منزل تھی۔ یہ سختیاں عام آدمی کے بس کی بات نہیں تھی۔ سہل کا یہ مدرسہ حسین کی پہلی با قاعدہ درس گاہ بھی تھا۔ سہل بن عبداللہ تستری حسین کی سوچوں سے کہیں اعلیٰ معرفت کے درجے پر فائز تھے۔ اس کا اظہار

وہ اپنے والد کو لکھے جانے والے خط میں کرتے ہیں:

> ''استادِ محترم شب بیداری، فاقہ کشی کے عالم میں کرتے ہیں۔ ہمیشہ جو کی روٹی سے روزہ افطار کرتے ہیں اور تین یا پانچ شبانہ روز کا روزہ رکھتے ہیں۔ نفس کو سخت سزائیں دیتے ہیں اور کڑی ریاضتیں کرتے ہیں۔ نہ دیوار سے ٹیک لگاتے ہیں۔ نہ پاؤں پھیلاتے ہیں اور نہ کبھی کسی غیر کے سوال کا جواب دیتے ہیں۔'' **(۳۰)**

سہل وہ زاہدِ طریقت تھے جو بے ریا تھے۔ خداوند قدوس نے انھیں جس مقام و مرتبے سے نوازا تھا۔ وہ اس کا چرچا نہیں کرتے تھے۔ وہ شرع پر عمل کرنے کو ہر مسلمان کے لیے ضروری خیال کرتے تھے۔ حسین کے بارے میں وہ فکر مند رہتے تھے کہ اس کا عمل شرع سے متصادم ہے۔ وہ منصور سے ملاقات میں اپنے اضطراب کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''حسین کی رفتار بہت تیز ہے، وہ ضرورت سے زیادہ مضطرب ہے۔ اس کے اشواق شدید ہیں اور اس کے مقاصد جلیل، مگر وقت سے کون لڑ سکتا ہے؟ اسے چاہیے شرع کی حد سے رہ کر بات سوچے۔ مسلمان شرع پر ہے تو مسلمان ہے ورنہ پر شور آدمی کے لیے اسلام میں کوئی جگہ نہیں۔'' **(۳۱)**

سہل تصوف کی باریکیوں کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ فرد کے ظاہر و باطن سے بھی واقف ہو جاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو دلوں کے بھیدوں تک رسائی کی قوت عطا کر رکھی تھی۔ حسین کے بارے میں آپ نے پیشین گوئی کرتے ہوئے کہا تھا:

> ''جو توفیق تمھیں نصیب ہوئی ہے وہ دہلیز ہے۔ اس کو پار کر کے جو کچھ پا سکو گے، وہ تمہارے مقدر سے بہت زیادہ ہوگا، بہت زیادہ۔'' **(۳۲)**

سہل بن عبداللہ تستری نمائش کے سخت خلاف تھے۔ آپ کرامات کے ظہور کو ناپسند کرتے اور نفس کے گھوڑے کو قابو کر کے سادگی اور شہرت سے پرے کی زندگی گزارنے کے قائل تھے۔ انھوں نے حسین کی روحانی تربیت میں اہم کردار ادا کیا۔ حسین سے مکالمے میں وہ اسے نصیحت کرتے ہوئے اور تصوف کے رازوں سے آگاہی دیتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''جواب دو۔ انہوں نے اور نرمی سے پوچھا۔ تم سے منسوب یہ شعبدے کیا ہیں۔ مجھے سیر اسماء کا شوق تھا حضرتِ اعلیٰ۔ اس نے ہچکیوں کے درمیان کہا۔ نفس کے ہاتھوں بچوں کے اس کھیل میں منہمک نہ رہو حسین۔ کیا محض اس لیے کہ اس تماشے سے تم سے سوا تمہارے گرد کے لوگ خوش ہوتے ہیں تم اپنی جان گھلاتے ہو۔ یہ گمراہی ہے حسین۔ اس سے بچو...... شیخ کامل نے کہا۔ نفس کو سزا دو حسین۔ باگیں اپنے ہاتھ میں رکھو۔ اس کی تربیت کرو۔'' **(۳۳)**

منصور:

منصور علمی محفلوں میں اٹھنے بیٹھنے والا، علما کی صحبت میں خوش رہنے والا وسیع معلومات رکھنے والا طبعاً ایک درویش صفت انسان تھا۔ بحث کی محفلوں میں منصور کو شکست دینا ناممکن تھا۔ منصور نے اپنا کاروبار بہت پھیلایا نہیں تھا مگر وہ جو کچھ بھی بناتا تھا اس میں اس کی ندرتِ طبع اور جدتِ خیال نے عجیب موشگافیاں پیدا کی تھیں۔ لوگ منصور کے نام کو ایک

سند سمجھتے تھے مگر اسے دوسرے ملکوں میں قافلے لے جانے کا شوق نہیں تھا۔ دشتِ سُوس کے کھنڈرات آب دز کے ساتھ ساتھ دور تک پھیلے ہوئے تھے اور مشرق کی طرف ذرا فاصلے پر وہ پل تھا جس کو پار کر کے ان شہتوت کے جنگلوں میں داخل ہوتے تھے جس کے سرے پر اس عظیم شخص کی بستی تھی۔ منصور زمانہ شناس تھا۔ اس نے اپنے بچے کے چہرے پر بکھری زردی اور ناامیدی کو دیکھ کر اس کے مرضِ عشق کا اندازہ لگا لیا۔ منصور حسین کو کلام الٰہی سے محبت کرنے کی نصیحت کرتا ہے اور اسے بتاتا ہے کہ عشق مجازی سے عشق حقیقی کہیں بہتر ہے۔ منصور حسین کو بتاتا ہے کہ شاعری ایک اذیت ناک تجربہ ہے آگے بڑھنے کے لیے اسے ترک کرنا اور راہِ حق کا مسافر بن کر ثابت قدمی اختیار کرنے سے ہی گوہرِ مراد حاصل کیا جا سکتا ہے:

''منصور نے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا شاعری ایک اذیت ناک پرالم تجربہ ہے، بے چین اور کربناک اور انجام کار روح اس سے سیراب نہیں ہو سکتی۔ تم کلام پاک میں اپنی سعادت تلاش کرو...... اگر تمہیں بصرہ میں قیام کرنا ہی تو میری کوئی شرط نہیں سوائے اس کے کہ تم کلام اللہ سے محبت کرو۔ یہ ابتدا اور انتہا ہے۔ محبت کرنا سیکھو اور دل میں وسعت پیدا کرو۔ دنیاوی محبتیں بھی گو توفیق کے بغیر نہیں اور دل کو گرم رکھتی ہیں۔ دن گزارنے کے بہانے ہیں اور اولیں مقام یہی ہے مگر جن پر رحمت خداوندی ہو وہ ثابت و سالم یہاں سے گزر جاتے ہیں۔'' (۳۴)

منصور تصوف کے اسرار و رموز سے بھی بخوبی واقف ہے۔ حسین جب منصور سے کہتا ہے کہ مجھے کسی مرشد کی ضرورت نہیں تو وہ جانتا ہے کہ بنا مرشد کے منزل کا حصول ناممکن ہے۔ بھلا کوئی کشتی بغیر ملاح کے کنارے کیسے لگ سکتی ہے:

''جب سالار کاروں کے بنا چلو گے، تنہا چلو گے تو کسی منزل پر نہیں پہنچ پاؤ گے، نہ سلوک کی اور نہ طریقت کی۔ منصور نے نہایت تلخی سے کہا۔'' (۳۵)

منصور نے اگرچہ حسین کی پیدائش سے قبل اسلام قبول کر لیا تھا اور وہ ایک مومن مسلمان تھا اس کے باوجود اس کے خون میں زرتشتی فلسفہ موجود تھا۔ سورج کا بڑا پن اور اس کا ہر ایک پر بلاتخصیص روشنی اور تپش پہنچانا اس کو کئی مفاہیم سے روشناس کراتا تھا۔ اقطع سے حسین کے بارے میں مکالمہ اس کے زرتشتی فلسفے کو سامنے لاتا ہے:

''منصور نے نہایت سکون سے کہا: اس کی سرشاری اور دیوانگی، فرزانگی اور ہوشیاری کسی کے تتبع میں نہیں ہوں گی۔ سورج تو ایک ہی ہوتا ہے۔ دھوپ بھی ہر جگہ خشک و تر بحر و بر پر ایک ہی قوت سے برستی ہے مگر کچھ چیزیں تپش پکڑ کر دھوپ بن جاتی ہیں۔ تمازت منعکس کرتی ہیں۔ آئینے کی طرح اور کچھ روشنی کو اپنے اندر جذب کر لیتی ہیں۔ اس کا مزاج بدل دیتی ہیں۔'' (۳۶)

تلاشِ حق میں خود اپنی ذات سے بیگانہ حسین کہ جو کبھی اپنے سر کے بال نوچتا اور سینہ کوبی کرتا تو کبھی ریت اپنے منہ اور آنکھوں میں ڈال لیتا ایسے میں منصور کے دل میں اولاد سے محبت کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگتا۔ وہ بے چینی و بے قراری کے عالم میں چپ چاپ خلا میں تکتا رہتا۔ اس کو دعا کے لیے الفاظ نہ ملتے۔ وہ حسین کو ہوش میں لانے کے جتن کرتا جب اس کی ایسی تمام کوششیں رائیگاں جاتیں تو وہ خون کے آنسو رونے لگتا:

''سانس روکے حسین اور بارگاہِ الٰہی میں بے لفظوں کی دعا کرتا منصور کرب سے اس کا اڑتا ہوا چہرہ

اور ڈوبتا ہوا دل۔ زندگی سے اس نے جو پایا تھا اسے کھونہ دینے کا خوف، پتا نہیں وہ کون سی منزل تھی جب آدمی کو نہ خوف ہوگا نہ ڈر۔''(۳۷)

منصور کو اپنے مسلمان ہونے پر رشک آتا تھا۔ اسے خوشی تھی کہ وہ آتش پرست سے خدا پرست بن گیا۔ منصور اسلامی تعلیمات کی پیروی کو ایک مسلمان کے لیے ضروری خیال کرتا تھا۔ اس کے نزدیک ارکان اسلام کی پابندی سے خدا کی خوشنودی حاصل کی جاسکتی ہے:

''اسے اپنے مقدر پر رشک آتا تھا۔ وہ ایک گبر، آتش پرست، مظاہر قدرت کی پرستش کرنے والا، یک بیک ان شعلوں کی مستعار روشنی سے نکل کر نور مبین سے سینچی گئی کھیتی بن گیا تھا۔ مزرع گلاب۔''(۳۸)

منصور کے حجاز کے سفر کے قافلے پر قرمطیوں کے حملے میں منصور موت کے دروازے پر پرسکون اور خوش نظر آتا ہے کیونکہ اس نے زندگی کی سب سے بڑی خوشی مدینہ منورہ میں حضورؐ کے روضہ کی زیارت کر لی تھی:

''منصور اونٹوں اور ہودوں، عماریوں کے ایک ڈھیر میں تقریباً دبا ہوا تھا۔ نیزہ اس کو کاٹتا ہوا آر پار ہوگیا تھا۔ مگر حیرت ہے وہ پھر بھی زندہ تھا۔ اس کی سانس چل رہی تھی...... بالآخر وہ سکون سے روبرو تھا۔ اس نے زندگی کی سب سے بڑی آرزو کے مطابق روضہ رسولؐ کی زیارت کر لی تھی۔''(۳۹)

منصور کے مطابق سب سے بڑا حاجت روا اللہ تعالیٰ ہے جو کسی بھی مسلمان کا سب سے بڑا اور اولین سہارا ہے۔ وہ پورے عالم کا رب ہے اور ہر ایک کی پکار سنتا ہے۔ دین سیدھی سادھی ایمان والی معمول کی زندگی گزارنے کا نام ہے۔ مذہب میں انتہائی غور وفکر بعض دفعہ گمراہی کی طرف لے جاتا ہے۔ وہ حسین کو ایک عام اور معمول کی مذہبی زندگی گزانے اور مذہب کی باریکیوں میں جانے سے منع کرتا ہے:

''حسین کیا تم ایک عام آدمی کی طرح زندگی کے دل میں پھر سے اپنی جگہ حاصل نہیں کر سکتے۔ تم جس خدا کے لیے عبادت وریاضت کرتے ہو وہ حضرت ابراہیمؑ کا خدا، صحابہ کرامؓ کا خدا، صدہا عظیم الشان آدمیوں کا رب اور مالک ہے۔ وہ انسان کو معمول کی زندگی گزارنے کا کہتا ہے اور وہ ان سے دور کہاں ہوتا ہے؟ اسے پکارو تو وہ سنتا ہے۔ وہ تو قریب تر ہے۔ کسی سہارے کی حاجت نہیں۔ کسی واسطے کی ضرورت نہیں۔ تم کن بھول بھلیوں میں گم ہو۔''(۴۰)

عمر بن عثمان مکی:

حضرت عثمان مکی بغداد کے محلّہ حربیہ کی ایک خانقاہ میں علوم دینی تشنگان علم تک پہنچاتے تھے۔ عثمان مکی نے ہی حسین کو اس بات کا احساس دلایا کہ دربار میں وہ اپنے اشواق کو پورا نہیں کر پائے گا۔ سالک راہِ شوق اور سیر الی اللہ کے لیے اپنے آپ کو جب تک تیار نہ کر لے اسے مزید نفع نہیں ہوگا۔ حضرت عثمان راہ سلوک میں اپنی تمام تر توجہ صرف کرنے کے

قائل تھے یہی انھوں نے حسین کو نصیحت کی:

''حضرت عثمان مکی نے خانقاہ میں حسین کو دیکھ کر کہا۔تم عدم و وجود کے کھیل میں غیر جانبدار ہو۔اپنی پوری توجہ صرف کرو گے تو یہ گتھیاں سلجھیں گی۔''(۴۱)

عثمان مکی بغیر مرشد کے راہِ تصوف پر چلنے کو حماقت سمجھتے تھے اگر چہ آپ روحانیت کے کئی رازوں سے آگاہ تھے لیکن اس کا پرچار اور اظہار کرنا خدا سے دشمنی کرنے کے مترادف سمجھتے تھے۔آپ کے پاس روحانیت کا ایک خزانہ گنج نامہ کی صورت میں تھا۔حسین نے وہ خزانہ بغیر اجازت کے اٹھالیا تو عثمان مکی کی باطنی آنکھ نے اس خزانے گنج نامہ کو چرانے والے کا انجام بھی دیکھ لیا:

''انہوں نے جائے نماز الٹا جہاں پر گنج نامہ رکھا رہتا تھا اور جس کو وہ کسی قیمتی راز کی طرح یہاں رکھتے تھے اور جو اکثر ان کے زیر مطالعہ رہتا تھا۔انہوں نے اٹھ کر جائے نماز الٹ دی۔اس کو جھٹکا۔ادھر ادھر دیکھا مگر گنج نامہ کہیں نہیں تھا۔روح کا گنج شائیگاں رازوں کا گنج گرانمایہ۔جو اسرار ورموز الٰہی سے واقف نہ ہوں،ان کے لیے سراسر ہلاکت اور جو جانتے ہوں ان کے لیے نہایت نازک مقامات تک بغیر راہ نما کے بیکار اور جو ان رازوں سے پردہ اٹھائے گا اس کے ہاتھ پاؤں کاٹے جائیں گے اور اس کو دار پر کھینچا جائے گا۔اس کا جسم باب البحر پر جھولے گا۔بغداد کی ساری ذلتیں اس کا نصیب ہوں گی۔گنج نامہ کوئی معمولی راز نہ تھا اس پر بے فیض کی دسترس اس کے لیے جان کا زیاں۔''(۴۲)

جنید بغدادی:

دشــتِ سُــوس کے حضرت جنید بغدادی مدرسہ نظامیہ کے استاد اعلیٰ،عالم بے بدل اور بغداد کی روح رواں ہستی تھے۔انھیں علم وعمل کا سرچشمہ تسلیم کیا جاتا تھا۔وہ بحر طریقت وشریعت کے شناور،انوار الٰہی کے مخزن اور روحانی علوم پر دسترس رکھتے تھے۔وہ شیخ الشیوخ،زاہد کامل اور سلطان محققین تھے۔انھوں نے حسین کے مرض کا کھوج لگالیا اور اسے بڑی بڑی باتیں کرنے،لوگوں سے اپنا آپ منوانے اور اونچی اُڑان اڑنے سے منع فرمایا:

''شیخ الشیوخ اس کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا۔یہ کیا ہے؟حسین نے اپنے جھومتے ہوئے سر کو سنبھالنے کی کوشش میں کہا۔میں ذات الٰہی میں فنا ہونا چاہتا ہوں۔نظارگی میں میری ہوشیاری اور سرمستی حائل ہے۔شیخ دیر تک مسکراتے رہے جیسے بہت محظوظ ہو رہے ہوں۔تم نے ہوشیاری اور سرمستی کے سمجھنے میں غلطی کی ہے۔کتنی بڑی بڑی باتیں کرتے ہو۔یہ سب تم نے کہاں سے سیکھا ہے۔جب تک اپنی نبضوں پر آزمانہ لو کچھ مت کہو۔یہ نمود ونمائش ہے جس میں تم گرفتار ہو۔تم لوگوں سے کیا منوانا چاہتے ہو۔''(۴۳)

جنید بغدادی مرشد کامل تھے۔وہ زنگ آلود دلوں پر روغن کرتے۔سات سال کی عمر سے مجاہدہ وریاضت نے

انھیں راہ تصوف کے سربستہ رازوں سے آگاہی دی تھی۔ وہ اپنے مریدوں کو تربیت نفس کی تعلیم دیتے، ابلیس کی حقیقت کو سمجھنے اور اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے کی تلقین کرتے۔ آپ نے حسین کو راہ سلوک کی مشکلات سے آگاہ کیا اور اسے بتایا کہ جب تک اللہ کی رضا نہ ہو اس میں کامیابی کا حصول ناممکن ہے۔ آپ نے حسین کو اس کی حیثیت اور مقام سے آگاہ کرتے ہوئے روحانیت کے میدان میں سخت ریاضت اور مجاہدات سے کام لینے کی ہدایت کی اور یوں اس کی تعمیر سیرت میں کلیدی کردار ادا کیا۔ آپ نے حسین کو راہ سلوک کے اسرار و رموز سے روشناس کراتے ہوئے بتایا:

''تم جن منزلوں کا ذکر کرتے ہو۔ جن پر ہونے کا تمھیں دعویٰ ہے ابھی تم کو ان راستوں پر چلنے والوں کی گردِ راہ تک کی خبر نہیں۔ بہروپیے بن کر خلق خدا کو گمراہ مت کرنا، پہلی شرط تمہاری تربیت ہے...... میرا کام بھٹکے ہوئے لوگوں کی راہنمائی کرنا اور کم از کم راہ کی نشاندہی کرنا ہے...... یہ جان جوکھوں کا کام ہے اور ان میں سخت محنت ہے۔ سمجھ لو کہ جب تک اس کا اذن شامل حال نہ ہو، کہیں پہنچ نہیں سکو گے۔ کیا یہ بچوں کا کھیل ہے۔'' (۴۴)

حضرت جنید بغدادی کا یہ عقیدہ تھا کہ انسان کی عبدیت ہی اس کے لیے سب سے بڑا انعام ہے۔ رسول اللہ بھی عبدیت میں خوش تھے۔ اپنی ذات کو یکسر فراموش کر دینا اور اس رب کو صدق دل سے پکارنا ہی اس تک پہنچنے کی راہ ہموار کرتا ہے۔ خدا تک پہنچنے کے لیے آسان راستے اختیار کرنا اور شعبدے بازی دکھانا ذات باری تعالیٰ سے دشمنی کرنے کے مترادف ہے۔ ان کے نزدیک ایسا کرنے والا قرمطی ہے۔ کائنات کے نظام کو تہس نہس کر کے اپنی ذات کو منوانا ظلم اور گمراہی ہے۔ ان کا حسین سے ہونے والا مکالمہ روحانیت اور تصوف کے پردے چاک کرتا نظر آتا ہے:

''خدا میں انسان کبھی مدغم نہیں ہوسکتا۔ پھر انھوں نے اس کی بے پناہ آنکھوں میں دیکھا۔ دیکھتے رہے اور آخر کہا۔ حسین ایسی باتیں تمھیں دار تک لے جائیں گی۔ کیا تم لکڑی کے سرے کو سرخ کرنے کے لیے کوشاں ہو۔ دوست سے جو بھی پہنچے اس کا انعام ہوگا۔ حسین نے متانت سے کہا۔ تم اپنے ہوش و حواس کو قائم رکھو۔ تمھیں معلوم نہیں اسلام میں حواس کھونے والے کا کوئی مقام نہیں۔ رسول خدا اپنی عبدیت میں خوش تھے۔ تمہارے خیال میں کیا وہ اس مقام سے آگے نہ جاسکتے تھے...... کوئی مقام رسول خدا کے مقام سے آگے نہیں ہے۔ کسی کو اس کی تمنا بھی نہیں کرنا چاہیے۔ یہ کفر ہوگا صحریاً حسین تم اپنے حواس میں نہیں ہو، بخدا تمھیں شعبدوں نے جو اتفاقاً تمھیں مل گئے ہیں، دیوانہ کر دیا ہے۔'' (۴۵)

جنید بغدادی حسین کی اصلاح کے لیے منصور کو اپنی حد میں رہنے کا مشورہ دیتے ہیں اور انھیں بتاتے ہیں کہ حسین ابھی راہ سلوک کی منازل سے ناآشنا ہے لیکن وہ بہت کچھ کا متلاشی ہے۔ اسے چاہیے کہ وہ حقیقت کو سمجھے اور اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے سے باز رہے:

''حضرت جنید بغدادی نے منصور سے کہا تھا۔ تمہارا بیٹا بھٹک گیا ہے۔ اس نے تو ابھی ابتدائی مراحل طے نہیں کیے۔ سلوک اور طریقت کی راہوں سے ناآشنا عجیب و غریب انسانوں کا مرجع

اور اپنی بساط سے بڑھ کر مدعی۔''(۴۶)

جنید بغدادی مرشد کامل ہونے کی حیثیت سے اس بات سے بخوبی آ گاہ تھے کہ خدائے لم یزل جب اپنے کسی بندے پر غیب کے پردے اٹھا دیتا ہے تو یہ اس بندے پر اس کا خاص فضل وکرم ہوتا ہے۔ اس بندے کو چاہیے کہ خدا کے ان رازوں کی امانت سمجھ کر حفاظت کرے اور اسے لوگوں کے سامنے بیان کرنے سے باز رہے۔ حسین کے بارے میں بھی ان کی یہی رائے تھی کہ یہ بغداد کے دیگر اولیائے کرام اور مشائخ عظام کے وقار کو بھی مجروح کرے گا۔ جنید کو اس بات کا بھی بخوبی ادراک تھا کہ صوفیہ ظلم وستم کے سامنے کلمہ حق بلند کرتے آئے ہیں انھیں اپنی جان کی قطعاً کوئی پرواہ نہیں تھی بلکہ وہ تو قدرت کے رازوں کو محفوظ کرنا چاہتے تھے:

''جنید کسی الجھے ہوئے مسئلے پر بحث کرتے ہوئے یکا یک چپ ہو گئے تھے اور اس جان کے خروش کو سن رہے تھے جس کی بے حوصلگی، بے ترتیبی، عنقریب اس سارے فرقہ درویشاں کو مبتلائے عذاب کرنے والی تھی۔ صوفیائے بغداد جو جرات و بے باکی کو پردوں میں پوشیدہ رکھتے تھے اور جن کے علم کی کوئی انتہا نہ تھی جو اپنی کھال کو بچانے کی نہیں، حرمتِ توحید کے گرداگرد نثار ہونے کو حاصل حیات سمجھتے تھے۔''(۴۷)

حضرت جنید بغدادی حسین سے ہمدردی رکھتے تھے اور انھیں اس کی بات کی روشنی تھی کہ وہ فنا فی اللہ کی منزل پر پہنچ گیا تھا 'جہاں ہم کو اپنی بھی خبر نہیں ہوتی' کے مصداق وہ ذات باری تعالیٰ کے عشق میں اپنی ذات سے بھی بے خبر ہو گیا تھا۔ حامد بن عباس نے جب حسین کے خلاف فتویٰ لینے کی کوشش کی تو جنید نے اس کی دیوانگی کو جواز بنا کر اس کا دفاع کیا:

''شیوخ مکرمین: میں آپ کی رائے معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ حامد بن عباس نے بہت ہی جھک کر کہا۔
کسی دیوانگی پر سند کی کیا ضرورت ہے وزیر مملکت، حضرت جنید اٹھ کر کھڑے ہو گئے تھے۔''(۴۸)
''مفروضوں پر تو کسی شخص کو معتوب نہیں کیا جا سکتا۔ اگر وہ آدمی دیوانہ ہو جیسا کہ وہ ہوگا تو قابل معافی ہے۔ دنیا دیوانوں اور فرزانوں سے مل کر ہی تو بنی ہے۔''(۴۹)

جنید نے حسین کو فطرت کے راز آشکار کرنے پر کسی حد تک سزاوار تو سمجھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس شیخ کامل کو اس حقیقت سے بھی آ گاہی تھی کہ فتنوں کے خیالی ہیولوں سے گھبرا کر حکام کیا کیا مضحکہ خیز حرکتیں کرتے ہیں اور اپنے ذاتی مفاد کے لیے مذہب کا سہارا لے کر، اس کی غلط تشریح کر کے اپنے مخالفین کو راستے سے ہٹا کر ظلم و بربریت کی نئی نئی داستانیں رقم کرتے ہیں۔

شبلی:

شبلی راہ سلوک کے بے شمار مراحل طے کر چکے تھے۔ وہ مجاہدات اور ریاضتوں سے نفس کو کڑی سزائیں دیتے تھے۔ بہت کچھ جانتے ہوئے بھی لبوں پر چپ کی مہر لگائے رکھتے تھے۔ وہ ایک ایسے دیوانے کی سرکشی پر حیران تھے جو پابند سلاسل ہو کر بھی ایسی آزادی کا قائل تھا جس سے اس کا اور اس کے خدا کا رشتہ کمزور سے کمزور تر ہو رہا تھا۔ وہ شہرت کے

حصول کے لیے حسین کے قدرت کے رازوں کو آشکار کرنے کے بڑے مخالفین میں سے تھے۔انھوں نے ہاتھ میں پکڑے پھول کی پتیوں کو بکھیر کر گویا حسین کے فنا میں بقا پانے کو اپنی باطنی آنکھ سے وقوع پذیر ہوتے دیکھ لیا تھا:

''شبلی مسکرائے۔ پھول کی پنکھڑیاں اب بھی ان کے ہاتھ میں تھیں۔ پھر انھوں نے ان پر ہاتھ پھیرا اور نہایت شاداب تر و تازہ مکمل گلاب حسین کی طرف بڑھا دیا۔حسین نے پھول سونگھتے ہوئے کہا۔خوب بہت خوب ۔شبلی صرف مسکراتے رہے ۔انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ فنا کیا ہے؟حسین نے جھک کر ان کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ایک زوردار ضرب لگا کر شبلی نے کہا، فنا،فنا،فنا۔حسین نے محسوس کیا اس کے ہر طرف فنا فنا کی صدائیں تھیں۔ ہر شے فنا فنا پکارتی تھی۔ ہوا اور کائنات سب معدوم ہوئے جاتے تھے۔زمین اور آسمان وہ خود اور اس کے ساتھی گھلے جاتے تھے۔ریزہ ریزہ ہو گئے تھے۔'' **(۵۰)**

شبلی اپنے میلے مرقع کی لاتعداد ٹکڑیوں اور میلی گدڑی میں حسین کے مقابلے میں زیادہ بارعب اور حقیقت آشنا لگتے تھے۔حسین کو بھی اس بات کا ادراک تھا کہ وہ نوافل کو فرائض سمجھ کر ادا کرنے ،رات رات بھر عبادت و ریاضت کرنے کے باوجود راہ سلوک کی اس منزل تک نہیں پہنچ پایا تھا جو اس مرد درویش کا خاصہ تھا۔حسین اس کے پیچھے گیا تو وہ غائب ہو گئے ۔ابن منصور جوحق کی تلاش میں تھا مزید مضطرب ہو گیا اور حضرت شبلی سے اس اسرار سے پردہ اٹھانے کو کہا تو شبلی گویا ہوئے:

''کوئی اسرار نہیں صرف ہمت ہے ۔ انکار کرنے کی اور اس پر کاربند رہنے کی مشیت کو قبول کرنے کی، امتحان اور آزمائش میں کھڑے رہنے کی،آسمانوں کی بادشاہت سے وہ دھکیل دیا گیا۔مگر اس کی سرشاری نہ گئی۔ اگر یہ سرشاری عطا ہو سکے میسر آئے، انھوں نے اپنے دل کے مرقع کو پھر اپنے گرد سمیٹ لیا اور مسکراتے ہوئے وہیں کہیں روئیدگی کے تانے بانے میں اس کی نگاہ سے گم ہو گئے ۔'' **(۵۱)**

حضرت شبلی روحانیت کے منصب عظیم پر فائز تھے۔آپ نے حسین کو بارہا حق کے راز ظاہر کرنے سے باز رکھا۔ اسے یہ بار آور کرایا کہ حق کے جو گوشے اس کے سامنے بے نقاب ہوئے ہیں ان سے انھیں بھی آگاہی حاصل ہے لیکن وہ بابانگ دہل اس کا اظہار کرنے سے باز رہتے ہیں ۔اپنی عقل وفہم کی بنیاد پر اس کا پرچار امانت میں خیانت ہے۔لفظ قابل اعتبار نہیں کیونکہ یہ عرفان ذات کی حقیقت کو بیان کرنے سے قاصر ہوتے ہیں:

''حسین !تم تو جری اور بہادر ہو۔ جو کچھ تمھیں سپرد کیا گیا ہے۔اسے پردہ راز میں رکھو۔تمہاری فہم وفراست سے یہ سب بالاتر ہیں ۔اس کو لفظ نہ دو۔ ہاں لفظ لامحدود کو محدود کر دیتے ہیں۔لفظ ۔اور یہ افشائے راز ہے۔اس کی سزا سخت ہے حسین ۔گمراہی سے بچو۔'' **(۵۲)**

شبلی نے جب بھی حسین کو 'انا الحق' کہنے سے باز رہنے یعنی قدرت کے رازوں سے پردہ اٹھانے سے منع کیا اتفاقاً ان کے ہاتھ میں ایک پھول ہوتا جس کی مسلی ہوئی پتیاں ریزہ ریزہ ہونے یعنی فنا ہو جانے کی طرف اشارہ کرتی

تھیں۔انھوں نے بارہا حسین کواس انجام یعنی فنا ہوجانے کی طرف متوجہ کیا لیکن وہ دیوانہ کیا کہ جسے بات سمجھ میں آجائے۔ حسین کے انجام کے وقت جب ہرطرف سنگ باری ہورہی تھی ایسے میں شبلی کا پھول مارنا اپنے اندر کئی مفاہیم رکھتا ہے۔ حسین کواس وقت پھول کی حقیقت معلوم ہوئی اوراسے سب سے زیادہ تکلیف اسی پھول کے لگنے سے ہوئی۔شبلی کا پھول مارنااورحسین کاانجام دیکھناایک مردقلندر کی تصوف اورروحانیت پرمہرتصدیق ثبت کرتا نظرآتا ہے:

''شبلی نے پھول اٹھایا۔اس کواپنے ہاتھ میں تولا۔نہایت آہستہ سے باز ولہرایااورحسین بن منصور حلاج کی طرف اس کی پرواز کودیکھتے رہے سارے سنگ وخشت کے ڈھیر میں یہ واحد ضرب تھی جس کی چُبھن نے اسے نہایت مضطرب کیا۔زخمی نگاہ اورآنکھیں جن سے خون رواں تھا۔شبلی پر ٹک گئیں۔پھروہ چیخ یوں گونجی کہ زماں ومکان نے اسے سنااورسناٹے میں آگئے۔''(۵۳)

شغب:

کنیزوں کے سوداگر جب دوردراز پہاڑی علاقوں میں آئے توانھوں نے تمام بہنوں میں سے شغب کوچن لیا۔تربیت گاہوں سے نکل کر جب وہ بغداد لائی گئی اورمقتدر کی ماں بنی تواس نے اپنے مقدر سے صلح کرلی۔مکتفی نے اپنے کمسن بھائی کے حق میں وصیت کی اوروہ تختِ خلافت پرلایا گیا تواس کی قسمت مہربان ہوگئی اوراسے لوگوں کی فرش راہ نظروں پرقدم دھرنا بہت اچھالگا۔شغب کوجب حسین کے اس تصرف کا بتایا گیا کہ وہ مستقبل میں جو پوشیدہ ہوتووہ جان لیتا ہے تو وہ اپنے،اپنے بیٹے اورعباسی خلافت کے مستقبل کو جاننے کے لیے زنداں کے دروازے تک گئی اس سے شغب کی اقتداراوراختیار میں دلچسپی دیکھی جاسکتی ہے۔شغب نے مقتدرکواپنے قابو میں کیا ہوا تھااوراس جہاندیدہ خاتون کواس بات کا بھی بخوبی علم تھا کہ وزیرمملکت حامد بن عباس وزیراعظم بننے کے خواب دیکھ رہا ہے اس لیے بیٹے مقتدرکوحامد کے شرارتی اورسازشی ذہن سے دوررکھنا انتہائی ضروری ہے لیکن شغب کواس بات کا بھی اندازہ تھا کہ اس کا بیٹا جواب خلیفہ ہے جلد ماں کے تسلط سے آزادی کی خواہش کرے گا:

''شغب نے محسوس کیا کہ اس حیرت میں وہ خلیفہ بھی کہیں موجود ہے جوخودسراور برسراقتدار ہے اور بہت دنوں تک اس کی مداخلت برداشت نہیں کرسکتا۔جس کواحکامات دینے اوراپنی بات منوانے کی عادت تھی اور جواس کا بیٹا ہی نہیں،مقتدر باللہ بغداد کی سلطنت کا وارث اورتخت خلافت پرمتمکن تھااورترک،عرب سرداراس کے اشاروں کے منتظر تھے اوراس کی آوازمشرق سے مغرب تک سنی جاسکتی تھی۔''(۵۴)

شغب کے حکم میں قطعیت ہوتی تھی۔اس میں لچک کی گنجائش نہیں ہوتی تھی۔یہی سختی اس نے بیٹے کی تربیت میں استعمال کی تھی۔شغب کا فلسفہ تھا کہ زندگی کوگزارنے کی بجائے بھرپور جیا جائے۔اس نے اپنے بیٹے کواچھا حکمران بنانے کے لیے چنداصول وضوابط بنائے ہوئے تھے:

''اسے ہمیشہ یہی پڑھایا جاتا تھا کہ صفت روباہی بادشاہ کے لیےضروری ہے۔اس کی نظرآدمیوں پرنہیں ان یافتوں پر ہونی چاہیے جواس کا مطمع نظر ہیں۔اس میں سفاکی کی صفت بلاامتیاز

ہونا چاہیے تا کہ وہ فیصلے کرتے ہوئے شخصی پسند اور ناپسند میں الجھ نہ جائے۔لوگوں کو اپنی تعمیر میں اینٹ اور چونے کی طرح استعمال کرنا چاہیے۔چاہے یہ چونا ان کی ہڈیوں کو پیس کر ہی کیوں نہ بنایا جائے۔نرم خوئی،خوش دلی اور رحم بے شک اچھی صفات ہیں مگر اچھے گلستان کی پرورش کے لیے نہایت بڑھی ہوئی شاخوں کو کاٹنا بھی انتہائی ضروری ہے۔خلیفہ قوت کا سرچشمہ ہے۔اپنے تیشہ حیات کا تیر،جس سے لوگ ترساں رہتے ہیں۔خوف کھاتے ہیں اور جس کی اطاعت میں بھی عافیت سمجھتے ہیں۔وہ انگڑائی لیتا ہے اور دکھائی دے تو اوسان خطا کر دے۔لوگ کندھوں پر اپنے سر کو اس کی مہربانی سمجھیں۔اس کی امانت خیال کریں اور کوشاں رہیں کہ اسے خوش رکھ سکیں۔سرچشمہ قوت!ہاں خلیفہ کو ایسا ہونا چاہیے۔"(۵۵)

شغب کو حامد سے خطرات کی بو آتی تھی۔وہ جانتی تھی کہ یہ شخص ایک دن مقتدر کو اس کے تسلط سے آزاد کرا دے گا۔اس لیے شغب کی عقابی نگاہوں نے آنے والے خطرات کا احساس کرتے ہوئے مقتدر کو حامد سے باز رہنے کا مشورہ دیا:

"حامد سے محتاط رہا کرو بیٹے۔نخوت پسند اور پرغرور شخص ہے۔"(۵۶)

شغب ایک مغرور اور خود پسند عورت ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ماں بھی ہے جو اپنے بچوں کے لیے بے لوث اور پرخلوص جذبات رکھتی ہے۔ناول میں وہ ایک ہمدرد ماں کے روپ میں مقتدر سے پیار و محبت کے جذبات رکھتی بھی نظر آتی ہے:

"وہ اسے کچھ نہیں کہے گی۔نہ کوئی حکم،نہ کوئی سفارش تا کہ وہ یہ نہ سمجھے کہ وہ حائل ہو رہی ہے!ہرگز نہیں۔وہ اس کے راستے کے لیے دیوار نہیں بنے گی۔اس کا دل کیسا بھی خون خون ہو رہا ہو مگر وہ اپنے احسانات نہیں جتائے گی۔اس نے جو کچھ کیا اولاد کے لیے کیا۔"(۵۷)

شغب حسین کو راہ حق کا مسافر اور سلوک کی اعلیٰ منازل پر دیکھتی تھی۔جب حسین کو دار تک لے جانے کا فیصلہ ہو گیا تو اسے شغب نے انتہائی ناپسند کیا اور اسے عباسی حکمرانوں کے لیے فال بد سے تعبیر کیا۔حسین کی سزا پر وہ انتہائی مضطرب نظر آئی اور اس کا دل خون کے آنسو رونے لگا:

"شغب نے اپنے خانہ باغ میں جو قصر خلافت سے دوسری طرف تھا پھولوں کی کیاریوں کے درمیان چہل قدمی کرتے ہوئے سنا کہ قاضی ابو عمر نے انا الحق کہنے والے دیوانے کو سزائے موت دی ہے تو وہ لرز گئی۔بھلا مقتدر کے لیے اب دعا کون کرے گا۔اس کی درازی عمر کے لیے،اس کی صحت و طاقت کے لیے،اس کے بخت رسا کے لئے۔"(۵۸)

شغب نے حسین کے فرار کا منصوبہ بنایا اس کے نزدیک وہ بلا قصور اس قید سخت میں تھا اور عنقریب موت کے منہ میں دھکیل دیا جانے والا تھا:

"یا شیخ! میں نے آپ کے یہاں سے فرار کا منصوبہ بنایا ہے۔اگر آپ صاد کریں تو آج ہی رات نکل جائیں۔"(۵۹)

حسین شغب کی رہائی کی پیش کش کا مثبت جواب نہیں دیتا کیونکہ اس کے نزدیک زندگی اول تا آخر فنا ہے، ظاہر و باطن فنا ہے اور شہادت تو مقدر والوں کا نصیب ہوتی ہے۔شغب کسی صورت بھی حسین کو موت کے منہ میں جاتا نہیں دیکھ سکتی۔ وہ آخری حل کے طور پر اپنے خلیفہ بیٹے مقتدر کو حسین کی جان بخشی کی درخواست ایک خط لکھ کر کرتی ہے:

''مقتدر نے اپنی ماں ام جعفر کا خط لیا اور پڑھا۔ یہ درخواست تھی حسین بن منصور کو معاف کر دیا جائے، اس سے درگزر کرنے کی۔ یہ کہ وہ صرف دیوانہ تھا اور دعا گو تھا اور عالم ربانی تھا۔ اس کا درجہ بڑا تھا۔ وہ اگر احوال کی وجہ سے اناالحق کہتا تھا تو اس میں اس کا کوئی قصور نہ تھا۔ یہ اس کی دعاؤں کی برکت تھی کہ جعفر (مقتدر) تخت خلافت پر جلوہ افروز تھا اور فرانس کی سفارتیں اس کی منتظر تھیں۔ اگر حسین بن منصور معاف کر دیا جائے تو ام جعفر مطمئن اور خوش ہوگی اور درازی عمر و بادشاہت صحت کی دعا کرے گی۔''(۶۰)

شغب حامد کی شخصیت کے بارے میں خوب جانتی تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ حامد حسین کے خون سے اپنے ہاتھ ضرور رنگے گا۔ وہ حسین کو حامد بن عباس کے بارے میں محتاط رہنے کا کہتی ہے:

''یا شیخ۔ آپ حامد کو نہیں جانتے۔ ام جعفر نے کہا۔''(۶۱)

شغب کو اس بات کا بھی قلق تھا کہ اس کا بیٹا جو ہمیشہ اس کا تابع فرمان رہا تھا اب مکمل طور پر حامد بن عباس کے اشاروں پر ناچ رہا تھا تبھی تو اس نے اپنی ماں کو معاملاتِ سلطنت میں مزید مداخلت سے روک دیا تھا:

''مقتدر نے شغب کو منع کیا کہ وہ معاملاتِ سلطنت اور سیاست میں دخل نہ دیا کرے۔''(۶۲)

شغب اگرچہ ایک مضبوط اعصاب کی کامیابیاں سمیٹنے والی خاتون تھی لیکن وہ حسین کو حامد کے شر سے نہ بچا سکی۔ اپنے رہنما کو مثلہ ہونے اور دار پر جھولنے سے نہ بچا سکی۔ اپنی تمام تر ذہانت، معاملہ فہمی اور حسین سے حد درجہ محبت رکھنے کے باوجود اسے ایک شاطر دشمن سے شکست ہوگئی تھی:

''پردوں اور بارگاہوں سے گزر کر جہاں ہوا کا گزر بھی ممکن نہیں ہوتا۔ یہ صدا اس تک پہنچی تھی۔ شغب اپنے محل میں ماتم کناں، اپنی بے بسی پر مضطرب اور سینہ کوبی کر رہی تھی۔ حامد نے اس سے بدلہ لے لیا تھا۔''(۶۳)

حوالہ جات

۱۔ اسلوب احمد انصاری، اردو کے پندرہ ناول،(لاہور: مکتبہ قاسم العلوم:س۔ن)ص۲۵۳

۲۔ جمیلہ ہاشمی،دشتِ سُوس:حسین بن منصور حلاج۔ایک غنائیہ ،(لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء)،ص۳۶۸۔۳۶۹

۳۔ ایضاً،ص۱۸۴ ۴۔ ایضاً،ص۳۶۹ ۵۔ ایضاً،ص۱۶۴

۶۔ ایضاً،ص۱۴۲ ۷۔ ایضاً،ص۱۸۰ ۸۔ ایضاً،ص۱۸۲۔۱۸۳

۹۔ ایضاً،ص۲۲۶ ۱۰۔ ایضاً،ص۳۳۹ ۱۱۔ ایضاً،ص۳۷۰

۱۲۔ ایضاً،ص۴۵۸ ۱۳۔ ایضاً،ص۴۶۵ ۱۴۔ ایضاً،ص۷۹۔۸۰

۱۵۔ ایضاً،ص۲۷۰۔۲۷۱

۱۶۔ مشتاق احمد میاں،جمیلہ ہاشمی:شخصیت وفن ،(بہاول پور،اسلامیہ یونیورسٹی،۱۹۹۵ء)،مقالہ برائے پی ایچ ڈی اردو،ص۲۵۴

۱۷۔ ایضاً:ص۲۶۷

۱۸۔ دشتِ سُوس:حسین بن منصور حلاج۔ایک غنائیہ،ص۲۲۳

۱۹۔ انتظار حسین،لاہور نامہ:دار پر چڑھنا منصور کا۔ناول لکھنا جمیلہ ہاشمی کا)،روزنامہ مشرق،(لاہور،۵/دسمبر۱۹۸۳ء)،ص۷

۲۰۔ دشتِ سُوس:حسین بن منصور حلاج۔ایک غنائیہ،ص۹۷

۲۱۔ ایضاً،ص۲۱۸ ۲۲۔ ایضاً،ص۲۲۲ ۲۳۔ ایضاً،ص۲۷۱

۲۴۔ ایضاً،ص۲۲۲ ۲۵۔ ایضاً،ص۱۴۳ ۲۶۔ ایضاً،ص۲۹۶۔۲۹۷

۲۷۔ اسلم سراج الدین،حسین بن منصور،مشمولہ:فنون(لاہور،نومبر/دسمبر۱۹۸۵ء)،ص۱۳۸

۲۸۔ دشتِ سُوس:حسین بن منصور حلاج۔ایک غنائیہ،ص۴۴۲

۲۹۔ ایضاً،ص۴۲۹ ۳۰۔ ایضاً،ص۴۸ ۳۱۔ ایضاً،ص۵۹

۳۲۔ ایضاً،ص۹۱ ۳۳۔ ایضاً،ص۱۸۱ ۳۴۔ ایضاً،ص۹۰

۳۵۔ ایضاً،ص۱۶۴ ۳۶۔ ایضاً،ص۳۲۴ ۳۷۔ ایضاً،ص۳۵۸

۳۸۔ ایضاً،ص۳۶۲ ۳۹۔ ایضاً،ص۳۶۳ ۴۰۔ ایضاً،ص۳۴۶۔۳۴۷

۴۱۔ ایضاً،ص۱۵۰۔۱۵۱ ۴۲۔ ایضاً،ص۱۶۷ ۴۳۔ ایضاً،ص۱۷۵

۴۴۔ ایضاً،ص۱۷۶ ۴۵۔ ایضاً،ص۲۳۴۔۲۳۵ ۴۶۔ ایضاً،ص۳۵۲

۴۷۔ ایضاً،ص۳۹۵ ۴۸۔ ایضاً،ص۴۲۷ ۴۹۔ ایضاً،ص۴۳۷

۵۰۔ ایضاً،ص۳۱۸۔۳۱۹
۵۱۔ ایضاً،ص۳۲۰۔۳۲۱
۵۲۔ ایضاً،ص۳۹۳
۵۳۔ ایضاً،ص۴۹۵
۵۴۔ ایضاً،ص۴۱۵
۵۵۔ ایضاً،ص۶۱۶۔۶۱۷
۵۶۔ ایضاً،ص۴۱۷
۵۷۔ ایضاً،ص۴۱۸
۵۸۔ ایضاً،ص۴۷۲۔۴۷۳
۵۹۔ ایضاً،ص۴۷۷
۶۰۔ ایضاً،ص۴۷۹
۶۱۔ ایضاً،ص۴۷۷
۶۲۔ ایضاً،ص۴۷۹
۶۳۔ ایضاً،ص۴۹۳